مترجمہ خواجہ بدر ایم اے

نظریۂ ارتقا اور مذہب

جب ڈارون کی کتاب "آغازِ انواع" ۱۸۵۹ میں شائع ہوئی تو نظریۂ ارتقا نے مذہبی فکر میں ایک فیصلہ کن اثر ڈالا۔ ڈارون سے کافی عرصہ پہلے، اٹھارہویں صدی ہی میں، ہیگل نے ارتقا کا ایک تاریخی تصور پیش کیا تھا جس کے مطابق سماجی ادارے، رسوم اور عقاید منزل بہ منزل تبدیل ہوتے رہے ہیں اور کافی تغیرات کے بعد انھوں نے موجودہ شکل اختیار کی ہے اور آپ آہستہ آہستہ ایک دوسری اور اغلباً بہتر صورت میں ظاہر ہوں گے۔ مختلف انواع کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت کی تشریح بعض قدیم یونانی فلاسفہ نے "انتخاب طبعی" کے تصور کی مدد سے کی تھی۔ مذہبی رجحان رکھنے والوں کے نزدیک اس کی تشریح خدائی مقصد اور مشیئت کے ذریعہ آسانی سے کی جاتی رہی لیکن مختلف مفکرین اپنے اپنے انداز میں انتخاب طبعی کے نظریے کو پیش کرتے رہے۔ ڈارون کا کام صرف یہ تھا کہ اس نے ارتقا اور انتخاب طبعی کے نظریات کو ایک تجربی طور پر قابل تصدیق مفروضہ کے طور پر پیش کیا۔ یعنی اس نے اس نظریے کو اس صورت میں پیش کیا کہ ہم کئی قسم کے قابل مشاہدہ واقعات کی پیش گوئی کر سکتے ہیں جن کی تصدیق بعد میں وقوع پذیر حالات سے ہو سکتی ہے۔

ڈارون اور اس کے پیروؤں کے پیش کردہ نظریہ ارتقا کے چار اساسی تصورات تنازع للبقا، بقائے اصلح، توارث اور تغیرات ہیں۔ ہر زمانے میں اتنے نامی اجسام (ORGANISMS) پیدا ہوتے ہیں کہ وہ سارے کے سارے اپنے ماحول میں نمو پذیر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ اپنی بقا کے لئے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہو جاتے ہیں۔ جو اپنے ماحول سے زیادہ مطابقت کی صلاحیت رکھتے ہیں باقی رہتے اور نسل کشی کرتے ہیں اور باقی فنا ہو جاتے ہیں۔ باقی رہنے والے انواع کی مطابقت

پذیری (adaptation) خواہ وہ کسی نئے عضو کی شکل میں ظاہر ہو یا کسی پہلے عضو میں کسی اچھی تبدیلی کے باعث ہو قائم رہتی ہے۔ کیونکہ توارث کے قانون کی رُو سے ایک نوع کے افراد اپنے والدین سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مشابہت عینیت نہیں بن جاتی چنانچہ ایک ہی نامی جسم سے پیدا ہونے والے آپس میں بھی مختلف ہوتے ہیں اور اپنے والدین سے بھی مختلف۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہے کہ نئے پیدا ہونے والوں میں سے بعض اپنے والدین سے زیادہ ماحول سے مطابقت کی صلاحیت رکھتے ہوں اس طرح یہ تغیرات (MUTATIONS) نسل بہ نسل جمع اور محفوظ رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک زمانے کے بعد بعض اعضا ایسے نمودار ہوتے ہیں جو پہلے اعضا سے کہیں زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ جب یہ فرق کافی نمایاں ہو جائے تو اس کے نتیجہ میں جو نوع متشکل ہوتی ہے ہم حیاتیاتی طور پر اسے ایک علیحدہ نوع کا نام دیتے ہیں ڈارون کا خیال ہے کہ انسان کا آغاز اسی عمل کا نتیجہ ہے۔

جہاں نظریۂ ارتقا نے حیاتیاتی دائرے میں وسیع تجربی تصدیق حاصل کی وہاں دوسرے علوم و فنون میں بھی اس کا عمل دخل زیادہ ہوتا گیا جس طرح غیر نامیاتی میدان میں حرکیات کے مسائل حل کرنے میں میکانکی طریقۂ کار کو شاندار کامیابی ہوئی جس کے باعث مفکرین نے اسی طریقۂ کار کو دوسرے میدانوں میں بھی استعمال کرنا شروع کیا حتیٰ کہ انہوں نے ساری کائنات کو ایک نامیاتی مشین کے طور پر سمجھنے اور پیش کرنا شروع کیا، اسی طرح زندگی کے آغاز اور ارتقا کو سمجھنے میں نظریہ ارتقا کی کامیابی کے باعث مفکرین نے اس کو تشریحی اصول کے طور پر دوسرے ایسے میدانوں میں استعمال کرنا شروع کیا جہاں ڈارون اور اس کے پیروؤں نے کبھی استعمال نہ کیا تھا۔ غیر نامیاتی میدان میں خصوصاً ارضیات اور ہیئت میں اصول ارتقا کے استعمال سے کئی مسائل شاندار طریقے سے حل ہو گئے۔ انیسویں صدی سے پہلے زمین کے قشر (CRUST) کے ارتقا اور نظام شمسی کی ساخت کے متعلق کئی نظری مفروضات پیش کئے جاتے رہے تھے لیکن انیسویں صدی میں (کچھ ڈارون سے پہلے اور خاص طور پر اس کے نظریۂ ارتقا کی کامیابی کے بعد) حقائق اور واقعات کا اتنا مواد

جمع ہو گیا جس نے مخالف نظریات کے درمیان ایک قطعی فیصلہ صادر کر دیا اور ان اشیا کے ارتقائی منازل کی طرف واضح راہنمائی کر دی۔ اس طرح عمرانیات اور نفسیات کے کئی مسائل کا مطالعہ اسی اصول کی روشنی میں کیا جائے گا۔ انسان کے کئی ثقافتی ادارے مثلاً مذہب حتیٰ کہ خود انسانی ذہن کی تشریح بھی اسی اصول کی مدد سے کی جانے لگی اور یہ اصول پیش کیا گیا کہ ان کی موجودہ شکل و ہیئت ایک طویل ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے ان کی موجودہ حالت کی کئی خصوصیات ایسی ہیں جو پہلی قدیم حالت میں موجود نہ تھیں۔

جب نظریہ ارتقا حیاتیات کے دائرے سے نکل کر دوسرے علمی میدانوں میں داخل ہوا تو اس کی چند خصوصی صفات جو علم حیاتیات کے مسائل حل کرتے وقت اس میں موجود تھیں ختم ہو گئیں وہ صفات جو باقی رہ گئیں تین ہیں: اول کسی شے کی وسیع ترین وضاحت اور تشریح کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تاریخی آغاز کا سراغ لگایا جائے۔ دوسرا یہ کہ نقطۂ آغاز کا یہ سراغ محض زمانی تسلسل کا معاملہ نہیں بلکہ اس میں نشو و نما اور تکمیل و پختگی کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ یہ ترقی اخلاقی حیثیت سے نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک وجود جو پہلے کبھی سادہ حالت میں تھا اب بہت زیادہ پیچیدہ اور مرکب حالت اختیار کر چکا ہے۔ مرور زمانہ اور ماحول کی تبدیلی سے اس میں ساخت اور تفاعل کے کئی ایسے تغیرات رونما ہوتے ہیں جو پہلے موجود نہ تھے لیکن اب ان کی موجودگی کے باعث وہ اپنے ماحول سے زیادہ مطابقت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ تیسرے مطابقت کا تصور۔ یہی اصول ہے جس کے باعث ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سا نیا تغیر اس قابل ہے کہ وہ محفوظ رکھا جائے اور کونسا ایسا ہے جو صرف عارضی ہے ہر نیا تغیر ایک ماحول میں پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ مرور زمانہ سے وہ اپنے ماحول سے مناسب مطابقت پیدا کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے اس کے بعد وہ اپنے وجود میں باقی رہتا ہے اور افزائش نسل کر سکتا ہے لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں ارتقا کا عمل دخل ہے وہاں گراوٹ، انحطاط اور تنزل بھی کارفرما ہے کیونکہ نئی انواع کی کامیابی ان موجودہ انواع کی تباہی یا زوال کا موجب بنتی ہے جو ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں کامیاب

نہیں ہوتے۔

نظریۂ ارتقا کے اثرات و نتائج صرف ان علوم تک محدود نہ رہے۔ اس کی کامیابی نے مفکرین کو اس کے مختلف استعمالات کی طرف متوجہ کیا اور یہاں تک خیال کیا جانے لگا کہ یہ ساری کائنات خود ایک ارتقائی عمل ہے اور اس کی صحیح ماہیت کا علم اسی نظریے کی روشنی ہی میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک انقلابی مفروضہ تھا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک اساسی نمونہ یا ساخت موجود ہے جس کے مطابق ہر واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے یا ظہور پذیر ہونے کے بعد اس کے مطابق نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک عجیب و غریب مفروضہ مضمر تھا جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی واقعہ یا شے کی بامعنی تعلیلی تشریح سے کیا کیا مراد ہو سکتی ہے۔

تصور ارتقا کی اس عالمگیریت سے پہلے مغربی دنیا دو اسی قسم کے تصورات سے آشنا تھی جن میں رشتے کے مفروضات بھی شامل تھے۔ ایک نقشۂ کائنات تو وہ تھا جس کو افلاطون اور ارسطو نے قائم کیا تھا اور جس کی تشکیل بعد میں نو افلاطونیت نے اپنے نظریۂ فیضان (EMANATION) سے کی۔ اس نقشے کے مطابق تمام حقیقت کا منبع و مصدر ایک صورت یا وجود مطلق ہے جو انتہائی کمال کی حامل ہے۔ اسی کمال کے مختلف درجات یا پہلو اس کائنات کے مشہود موجودات میں بکھرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ کائنات کا یہ نقشہ سترھویں صدی عیسوی تک مغربی فکر کے ہر گوشے پر جاری و ساری رہا یہاں تک کہ میکانکی سائنس نے اس کے طلسم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اگرچہ مغربی فکر کے دینی حلقوں میں اس نقشے کا ذکر آج بھی موجود ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے علیت کی کسی مثال کا اہم عنصر اس کمال کا حصہ (یا سارا کمال) ہے جو علت میں موجود تھا اور جس کو معلول نے علت سے حاصل کیا۔ اس حالت میں یہ مفروضہ صحیح تھا کہ کسی معلول کی علت خوبی اور کمال میں اگر اس سے زیادہ نہیں تو برابر تو ضرور ہو گی۔ ہیوم نے اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی اس کا کہنا تھا کہ ہم علتوں کو اس طرح متصور کریں کہ ہمیں یہ فرض کرنا ہو گا کہ اس کائنات میں ایسے معلول موجود ہیں اور جن کا ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں جو ان معلولوں سے زیادہ مکمل و

کامل ہیں جن سے ہم نے آغاز کیا تھا۔ ہیوم نے اس کے برعکس دوسرے نقشے کو تسلیم کیا تھا جسکو مغرب نے ڈارون سے پہلے پیش کیا تھا۔ اس نقشہ کا بہترین نمونہ میکانکی سائنس میں نظر آتا ہے۔ یہ اس مطالبے کا نتیجہ تھا کہ سائنسی تحقیقات و تشریحات کی ایسی صورت ہونی چاہیئے کہ درست اور قابل تصدیق پیش گوئی کی جا سکے یہ مطالبہ درحقیقت کائنات کو تسخیر کرنے کے جذبے کا نتیجہ ہے جو یونانی فکر اور مغرب کے زمانۂ وسطیٰ کے عیسائی مفکرین کے فطری رجحان کے منافی تھا لیکن جو بعد میں مغربی فکر پر حاوی ہو گیا یہ صحیح ہے کہ ہم مستقبل کے واقعات پر قابو پا سکتے ہیں جہاں تک ہم اعتماد اور دوستی سے ان کے وقوع کے متعلق پیش گوئی کر سکیں اس نقطہ نگاہ سے یہ کائنات ایک دسیع و عریض مشین ہے جس کی مختلف حرکات ریاضیاتی قانون کے مطابق یکے بعد دیگرے واقع ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ہمیں اس وقت وقوع پذیر ہونے والی حرکت کا صحیح مقداری تجزیہ حاصل ہو جائے تو ہم بتا سکتے ہیں کہ بعد میں کسی وقت وہ کون سی صورت اختیار کرے گی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک میکانکی عمل کی دو یکے بعد دیگرے منزلوں میں قوت کی مقدار یکساں رہتی ہے۔ اگر موخر الذکر میں وہ قوت نہ ہو جو اول الذکر میں ہے یا اس سے زیادہ قوت کا حامل ہو تو ہم صحیح طور پر نہیں بتا سکتے کہ حرکت کی بعد کی حالت کیا ہو گی اس طرز فکر کے مطابق جو علتی رشتے کا تصور ہو گا اس کا تقاضا یہ ہو گا۔ کہ علت اور معلول کے درمیان مقداری مساوات ہو۔ علت اور معلول میں سے ہر ایک خصوصی حرکات ہیں اور قوت کی ایک ہی مقدار کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب علتی تشریح کا یہ نظریہ ایسے معاملات میں استعمال کیا گیا جیسا کہ مثلاً ہیوم نے کیا جہاں صحیح مقداری تجزیہ فی الحال ہماری سکت سے باہر ہے تو اس جگہ صحیح ریاضیاتی مساوات کے تقاضے پر زور نہ دیا گیا لیکن یہ مطالبہ بہرحال قائم رہا کہ اگر کسی معلول سے کسی علت کا استنباط کیا جائے تو اس کا اس طرح تصور کرنا چاہیئے کہ ہم معلول کے متعلق واضح پیش گوئی کر سکیں۔ اس تعلیلی رشتے کے اصول سے جو انقلاب الٰہیات میں ہوا اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ کانٹ کو اس کے ناگزیر ہونے پر اتنا ہی یقین تھا جتنا کہ ہیوم کو۔

تصور ارتقا کی اس آفاقی وسعت کے باعث ہم تیسرے مابعد الطبیعی نقشے اور نظریۂ علیت

تک پہنچتے ہیں۔ اس نقشے کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اس کائنات کو ایک وسیع تاریخی عمل تصور کریں جسمیں سادہ اشیاء سے زیادہ پیچیدہ اشیاء مسلسل پیدا ہوتی رہتی ہیں اور اپنے آپ کو ماحول سے مطابق کرتی رہتی ہیں۔ مختلف سائنسوں میں تسلیم شدہ تجربی علم کائنات کے اس تصور کے عین مطابق بیٹھتا ہے۔ اس نظریے کی سب سے زیادہ با اثر صورت کو صدوری ارتقا (EMERGENT) کہتے ہیں۔ اس کے نقطہ نگاہ سے تغیر کی وسیع ترین اور واضح ترین قسموں کو جو باقی رہتی اور افزائش نسل کرتی ہیں صدوری سطوح کہتے ہیں۔ تین مشہور سطح غیر نامی مادۂ زندگی اور باشعور ذہن ہیں[1]۔ پہلی سطح اس دنیا میں صدیوں تک موجود رہی تب کہیں جا کر دوسری سطح نمودار ہوئی اسی طرح لاکھوں اور کروڑوں سال کے بعد تیسری سطح کے ظاہر ہونے کا وقت آیا اگرچہ یہ سطح صرف انسان تک محدود ہے لیکن انسانی زندگی کی پیچیدہ ترین صورتیں بھی درحقیقت غیر نامی جواہر کی سادہ ترین شکلوں سے ہی پیدا ہوتی ہیں اس مابعد الطبیعی ماحول میں تعلیلی تشریح کا کیا مقام ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ تعلق بھی ابتدائی (GENETIC) ہے۔ معلول علت میں سے پیدا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے (عام طور پر ہوتا یہی ہے) کہ وہ علت سے زیادہ مرکب اور پیچیدہ ہو۔ یہاں بھی ایک کامیاب پیش گوئی کا مطالبہ موجود ہے اور اس معاملہ میں موجودہ نظریۂ علیت کے میکانکی تصور سے متفق ہے لیکن وہ اس اصرار میں (۳) سے مختلف ہے کہ تجربی حقائق کے اس وسیع حلقے میں (اور شاید ایک عالمگیر حقیقت کے طور پر بھی) ایک عمل کے بعد کی صورت نہ صرف پہلی صورت سے مساوی ہوتی ہے بلکہ بعض نئی صفات ظاہر کرتی ہے جن میں سے بعض محفوظ رہ سکتی ہیں اور اس طرح بعد میں دہرائی جاتی ہیں۔ تعلیلی رشتے کی تعبیر اس طرح ہونی چاہیئے کہ ایسی حالت کی تشریح ہو سکے۔ جب تغیرات پہلی بار ظاہر ہوتے ہیں تو اس نقطہ نگاہ سے ناقابل تشریح رہ جاتے ہیں کیونکہ ان کی تفصیلی ماہیت کا قبل از وقت اندازہ کرنا ممکن نہیں ہوتا جس چیز کی ہم پیش گوئی کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی قسم کے نئے واقعات ظہور پذیر ہوں گے۔ لیکن ایسی عمومی پیش گوئی اس نقطہ نگاہ کی رو سے علیت کے تصور کے ذریعے کی ہی جا سکتی ہے جو اس میں مضمر ہے۔ علت (خواہ ایک واقعہ ہو یا موثر شرائط

---

[1] لائیڈ مورگن اور الیگزنڈر کی تصنیفات دیکھئے۔

کا مجموعہ) اپنے معلول سے سادہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ معلول میں اگرچہ وہ علت سے ہی صادر ہوتا ہے چند ایسی صفات یا عمل کے ایسے طریقے ظاہر ہوں جو علت میں موجود نہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ایک لحاظ سے علیت کے متعلق یہ مفروضہ قدیم اور زمانۂ وسطیٰ کے تصور کا بالکل عکس ہے۔ ایک مفروضے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ علت میں ہر وہ صفت موجود ہو جو معلول میں نظر آتی ہیں دوسرے مفروضے کے مطابق علت مطلقہ میں وہ کمالات موجود ہوتے ہیں جو معلول میں نظر نہیں آتے

اب سوال یہ ہے کہ مذہبی فکر کے لئے نظریہ ارتقا کے نتائج کیا ہیں ؟

سب سے اہم خصوصی نتیجہ یہ تھا کہ اس نظریہ میں انسان کے آغاز اور اس کی ماہیت کے متعلق ایک فطرتیتی (NATURALISTIC) نقطہ نگاہ مضمر تھا۔ ڈارون کی کامیابی سے پہلے بائیبل کا بیان کردہ تخلیق آدم وغیرہ کا قصہ لغوی معنوں میں سائنسی صداقت سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی سے پہلے جو حقائق موجود تھے ان سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ حیاتیاتی انواع ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور ہر نوع کی خصوصی صفات والدین سے بچوں تک منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ خصوصی تخلیق کا نظریہ نہ صرف بائیبل کی تعلیم تھی بلکہ موجود حیاتیاتی مواد کے عین مطابق و موافق تھا۔ لیکن نئے سائنسی نظریے کے مطابق انسان انسان نما لنگور کا نزدیکی بھائی ہے اور یہ دونوں ایک مشترک مورث کی اولاد ہیں اور یہ سارا عمل کسی خصوصی تخلیقی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طبعی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس تصور کو قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ انسان کی وہ تکریم و تحریم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے جو اس کو خدا کی مخصوص تخلیقی مشیت کا نتیجہ قرار دیتی ہے اور جس کے مطابق وہ خدا کی صورت پر تخلیق کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ خالق کائنات کے وجود کی مختلف شہادتوں میں سے ایک شہادت بالکل ختم ہو جاتی ہے ـــــ وہ خالق جو ان عقلی و اخلاقی صفات کا حامل ہے جو انسان کا خاصہ ہیں۔ جب تک انسان کی تخلیق کے متعلق یہ تصورات تسلیم کئے جاتے رہے تو اس وقت خدا کے ساتھ وہ تمام خوبیاں منسوب کی جاتی رہیں جو انسان میں موجود ہیں اگرچہ خدا کے معاملہ میں وہ خوبیاں اپنی بہترین اور کامل ترین شکل میں موجود ہوتی ہیں لیکن جب انسان کے وجود کی تشریح خالص فطری قوتوں سے کی جانے لگی ـــــ ایسی قوتیں جو حیاتیاتی قانون

کے مطابق سادہ تر مخلوق میں کارفرما ہیں جو اس کے ساتھ مل کر ایک ہی مورث کی اولاد ہیں ——— تو واقعات کی تشریح کے لئے کسی عقلمند اور خیر مطلق خالق کی ضرورت نہ رہی۔ درحقیقت اس نظریے نے انتخاب طبیعی کی جو تصویر ہمارے سامنے پیش کی وہ انسان کے عقل و محبت کے نصب العین کے بالکل منافی تھی۔ اس کے مطابق ہر نوع دوسرے کو شکار کرتی ہے اور ہر ایک کے سامنے اپنی بقا اور اپنی بھلائی کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ پیدا ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جن میں سے بہت کم بڑھتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ ان کی اکثریت فنا ہو جاتی ہے جہاں پہلے اس کائنات کا تصور محبت، شفقت اور مقصدیت سے بھرپور تھا، وہاں اب اسی کائنات میں خون خرابہ اور کشت و خون عام ہے۔

بعض مفکرین اور خاص کر کیتھولک مفکرین کے نزدیک ان متضاد خیالات میں مصالحت ممکن تھی اگر انسانی جسم اور اس کے جبلیاتی افعال کو طبعی ارتقا کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ان کے ارسطاطالیسی تصورات کے مطابق اس میں کوئی عیب یا خرابی نہ تھی لیکن جہاں تک اس کے ذہن اور روح کا تعلق ہے جن میں وہ دوسری مخلوق سے نمایاں خصوصیت رکھتا ہے تو کیا ان کی خصوصی تخلیق کا ہم دعویٰ نہیں کر سکتے؟ یہاں ایک ارتقائی تغیر (VARIATION) پیدا ہوتا ہے جو اس کے حامل کو دوسرے جاندار انواع سے خاص طور پر متمیز کر دیتا ہے اور جس سے اس میں ایک نمایاں قدر اور خصوصی عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تغیر کے ابتدائی ظہور کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ارتقا کے حامیوں کا جواب یہ تھا کہ نظریہ ارتقا کو تقابلی نفسیات کے مسائل میں تفصیل سے استعمال کیا جائے اور اس طرح ثابت کیا جائے کہ انسانی ذہن کی نمایاں خصوصیات خود انتخاب اور مطابقت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہیں۔ ۱۸۵۹ء سے کافی عرصہ پہلے ہربرٹ اسپنسر نے اپنی کتاب "اصول نفسیات" شائع کی تھی جس میں اس نے انسان کے ذہنی قویٰ کی تشریح بطور ارتقائی پیداوار کے کی تھی اور اس کے پیروؤں کیلئے یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ اس تشریح کو اور زیادہ قابل قبول شکل میں پیش کر سکیں مثال کے طور پر انسانی تفکر (THINKING) کو ایک حیاتیاتی عمل کے طور پر پیش کیا گیا جو بقائے نسل کے لئے دوسرے جانوروں کے آزمائشی (TRIAL AND ERROR) طریقہ عمل سے کہیں زیادہ فائدہ مند

ہے لیکن اپنی ابتدا کے لحاظ سے (GENETICALLY) یہ دونوں ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں ان دونوں کے اختلافات کا باعث یہ نہ تھا کہ انسان میں ایک خصوصی نیا ملکہ یعنی عقل و ذہانت پیدا کیا گیا۔ بلکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ چند خصوصی تغیرات (VARIATIONS) ایک خاص منزل پر ظاہر ہوئے جن کی وجہ سے آزمائش (TRAILAND ERROR) کا عمل ایک مقررہ شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ اس طرح مختلف اعمال کے نتائج کا اندازہ قبل از وقت کیا جانے لگا۔ چنانچہ ماحول کی تبدیلیوں کے ساتھ زیادہ اعتماد اور بھروسے سے تطابقت پیدا کی جانے لگی۔ اس طرح انسان کی روح اور جسم دونوں انتخاب طبعی کی مدد سے قابل تشریح قرار دیئے گئے یہ عیسوی الٰہیات کے لئے ایک خوفناک چیلنج تھا۔

ارتقائی تصورات کو تسلیم کر لینے سے مذہبی فکر پر جو سب سے زیادہ اثر ہوا وہ یہ تھا کہ مختلف اعضا کی اپنے افعال اور مقاصد کے لئے صحیح مطابقت کی تشریح اب خالص طبیعیاتی طور پر کی جا سکتی تھی اس سے پہلے اس مطابقت کو خدائی مشیئت کے لئے بطور دلیل پیش کیا جاتا رہا تھا۔ چھوٹے درجے کے جانوروں میں جو عقل و ذہانت سے عاری ہیں اس قسم کی اپنے ماحول سے مطابقت کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ یہ ایک حکیم و دانا خالق کی ربوبیت کا نتیجہ ہے جو ان کے ہر فعل کی رہنمائی کرتا ہے تاکہ وہ اپنے اپنے مقاصد کو حاصل کرتے رہیں۔ اور صحیح طور پر اپنا اپنا وظیفۂ حیات پورا کرتے رہیں۔ اس کی مثال انسانوں کی بنائی ہوئی مشینوں سے دی جاتی تھی جو وہ چند مقاصد حاصل کرنے کے لئے بناتے تھے۔ یہاں تک کہ ڈارون سے پہلے ہیوم جیسا متشکک بھی اس استدلال کا کس حد تک قائل تھا۔ لیکن ارتقائی نقطۂ نظر سے کسی ماورائی ذات حکیم کی ضرورت نہ تھی۔ اس کو فرض کئے بغیر ہی یہ سب مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ بس جس بات کی ضرورت تھی وہ یہ ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ فطرت اتنی مخلوق پیدا کرتی چلی جاتی ہے کہ وہ سب کی سب اس ماحول میں نہ باقی رہ سکتے ہیں اور نہ افزائش نسل کر سکتے ہیں ہر نئی نسل میں اپنے سے پہلی نسل سے زیادہ تغیرات (VARIATIONS) ظاہر ہوتے ہیں عام طور پر یہ تغیرات بالکل معمولی ہوتے ہیں لیکن بعض دفعہ یہ بہت نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان کو تغیر نوعی (MUTATIONS) کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر ان مفروضات کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب

ہوگا کہ کسی حکیم پروردگار کی وساطت کے بغیر موجودہ مخلوقات کی تفصیلی ساخت کچھ اس قسم کی ہوگی کہ وہ اس ماحول میں زندہ رہ سکیں گے اور ان کی بھلائی کا انتظام پوری طرح ہوگا جو اس ماحول سے مطابقت کی قوت سے محروم ہیں وہ بقا کی جدوجہد میں ہار کر ختم ہو چکے ہیں۔ ارتقائی مفکرین کا کیتھولک الہیین کے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ تغیرات نوعی کچھ مرکب اعضا کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جن سے ایک بالکل نیا عمل سرزد ہوتا ہے جو اس مخلوق کے لئے بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح کے نمایاں تغیرات نوعی کا وجود تجربے سے ثابت ہو چکا ہے بعض دفعہ بالکل قدرتی حالات میں اور بعض دفعہ خود پیدا کردہ ماحول میں۔ مثلاً کسی جاندار میں پروں کا اول اول پیدا ہونا جس کے باعث وہ اڑنے کے قابل ہو جاتا ہے ارتقائی نظریے کے طبیعی مفروضات سے ہی سمجھ میں آسکتا ہے خاص طور پر جب ہم درمیانی صورتوں کو سامنے رکھیں جیسا کہ مثلاً اڑنے والی گلہریاں۔

پروٹسٹنٹ اساسیت کے نزدیک انسان کے متعلق یہ ارتقائی تصور عیسائی عقائد کے ساتھ کسی طرح بھی ہم آہنگ نہ تھا۔ اساسیین کا خیال ہے کہ بائیبل مذہبی صداقت کا ایک غیر متغیر ذخیرہ ہے اور اس لئے اگر بائیبل کو سامنے رکھا جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق ایک خصوصی عمل تھا۔ نظریۂ ارتقا کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پروٹسٹنٹ عقیدے کو خیرباد کہہ دیں جس کے مطابق بائیبل ایک ناقابل تردید الہامی کتاب ہے اور جو صداقت ازلی کا سرچشمہ ہے اس کے علاوہ اس نظریے سے انسان کے مذہبی تقاضوں اور اس کے انجام کے متعلق جو پرانے تصورات ہیں وہ سب یک قلم غلط ہو جاتے ہیں ان تصورات کے مطابق اس دنیا میں انسان کی طبعی زندگی ایک ماورائی نظام کے تابع ہے جس کے باعث وہ نیکی اور بھلائی کما سکتا ہے۔ انسان کی ایک روح ہے جس کی تقدیر ماورائے طبعی دنیا سے وابستہ ہے۔ خدا کے فضل کے بغیر وہ اپنے گناہوں کی بخشش کی توقع نہیں رکھتا — ایسے گناہ جو اسے ہمیشگی کی دوزخ میں ڈالنے کیلئے کافی ہیں جب خدا کا فضل اس کے شامل حال ہوتا ہے تو اس میں ایک معجزانہ انقلاب پیدا ہوتا

ہے جس کے باعث وہ جنت کی سعادتوں کا وارث قرار پاتا ہے۔ انسان کے گہرے تقاضے اور اس کی نجات کی ماہیت دونوں صرف ماوراء فطرت اصطلاحات میں بیان کی جاسکتی ہیں۔ اس کے دوسری طرف ارتقا کے نظریے کے مطابق انسان کی مکمل ساخت، اس کی تاریخ اور اس کا آغاز سب کی توضیح وتشریح خالص فطرتیتی نظام کے ذریعہ ہوسکتی ہے جو ایسے ابتدائی (GENETIC) قوانین کے ماتحت ہے جو حیاتیاتی میدان میں ہر جگہ قابل تصدیق ہیں۔

وہ لوگ جو ان حالات کے زیر اثر آزاد خیالی کے حامی ہوگئے ان کے نزدیک مذہب اور نظریہ ارتقا میں مطابقت ممکن تھی۔ ان میں سے جو چند قدامت پسند تھے یعنی جدیدیت پسند انہوں نے کائناتی (COSMOLOGICAL) نظام میں نظریہ ارتقا کو داخل کرنے کے تمام ممکنہ نتائج کو تسلیم کرلیا بالکل اسی طرح جس طرح زیادہ جدت پسند آزاد خیال مفکرین نے کیا تھا۔ لیکن انہوں نے بھی اپنے عیسوی عقاید کو انسان کے آغاز اور انسانی تاریخ کے تمام ادوار کی ڈارونی تشریح کے درمیان تطبیق پیدا کرلی چونکہ یہ تطبیق بعض اہم تبدیلیوں کا تقاضا کرتی تھی اس لئے ان تمام عناصر کا مطالعہ ضروری ہے جس کے باعث یہ قرطابقت پیدا ہوئی۔

اوّل، یہ جدیدیت پسند آزاد خیالوں کی طرح ایسے مفکرین تھے جن کا خیال تھا کہ تحقیق و تشریح کے جدید سائنسی طریقے اساسی طور پر صحیح ہیں۔ جدید سائنس کے دو مفروضات یعنی یہ دنیا ایک نظام معقول ہے اور صداقت کا قطعی معیار تفصیلی تجربی تصدیق ہے ان کے نزدیک درست تھے۔ ان کو اس حقیقت کا یقین تھا کہ ان سائنس دانوں کا مقصد جو نظریہ ارتقا کی تعمیر میں منہمک تھے مذہب کی مخالفت نہ تھا بلکہ ان کا مدعا تجربی صداقت کا حصول اور اس سے وفاداری تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر الٰہیات نے ان کے طریقہ کار یا نتائج کی مخالفت کی تو ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے گی۔ مذہب حق وصداقت کی پاسداری کا تقاضا کرتا ہے اس لئے جہاں کہیں صداقت مل سکے اسے اس کو قبول کرنا اور اپنے آپ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اسے ان طریقوں کو اپنانا چاہیئے جن کے ذریعہ حق وصداقت کی دریافت بہترین طریقے سے ہوسکے۔ اگر

الہیات ایسا نہ کر سکے تو ہر عقلمند شخص دیانت داری سے اسے ترک کرنے پر مجبور ہوگا۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ جب جدیدیت پسند لوگوں نے اس ہم آہنگی کے تقاضوں کا جائزہ لیا جو نظریۂ ارتقا کے قبول کرنے سے پیدا ہوتے ہیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ حقائق اور اقدار جو حقیقی معنوں میں مذہبی تجربے کے لئے اساسی اور اہم ہیں وہ اپنی جگہ قائم اور برقرار رہتے ہیں اور جن باتوں کے ترک کرنے کا مطالبہ اس کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ اس کے لئے کبھی بھی ناگزیر اور لازمی نہ تھے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں شلائرماشر کا مذہب کے معاملہ میں تجویز کردہ تعمیری تجربی نقطہ نگاہ کارآمد ثابت ہوا۔ اس نقطہ نگاہ سے کوئی روایتی عیسوی عقیدہ (خواہ وہ بائیبل میں کتنی ہی وضاحت سے کیوں نہ بیان ہوا ہو) بھی عصری مذہب کے لئے مطلقاً اہم نہ تھا۔ وہ ایک گذشتہ مذہبی مشاہدے کی عقلی تعبیر ہے جس کو اُس زمانے کے سائنسی مفروضات اور معقولات کی زبان میں پیش کیا گیا ہے ـــــ لیکن یہ تعبیر ہمارے لئے آخری اور قطعی نہیں۔ جو حقیقت ہمارے لئے یقینی ہے وہ وہ شے ہے جس کو کوئی سائنسی واقعہ (FACT) یا صداقت غلط یا کالعدم قرار نہیں دے سکتی اور یہ ہے ہمارا اپنا مذہبی مشاہدہ ـــــ یعنی وہ حالات جو بلاواسطہ ہمارے داخلی زندگی میں قابل تصدیق ہیں، ان تصورات اور نصب العینوں کی مدد سے جو ہمیں عیسائی روایات سے حاصل ہوئے ہیں ہم نے وہ عظیم روحانی سعادات (GOODS) حاصل کر لی ہیں جن کو انسانوں کی اشد ضرورت ہے۔ مثلاً امن، امید، پریشانی میں راہنمائی، نفسانی ترغیبات پر قابو پانے کی قوت وغیرہ۔ ان اقدار کو اپنی زندگی میں عملی شکل دینا ایک حقیقت ہے جو ناقابل تردید ہے۔ جدیدیت پسندوں کے لئے الہیات اس کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے اور ہو سکتا ہے کہ ہمیں کبھی اس میں ترمیم کرنی پڑے۔ اب اگر غور کیا جائے تو اس حقیقت اور نظریۂ ارتقا میں کوئی تضاد اور الجھن نہیں۔ انسان کا آغاز کیسے ہی ہوا ہو اور حیاتیاتی دنیا میں اس نے اپنا مقام کس طرح بھی حاصل کیا ہو ـــــ یہ حقیقت ہے کہ وہ اس دنیا میں موجود ہے اپنے تمام تجربات اور اپنی تمام خاصیتوں اور قابلیتوں کے ساتھ۔ اس میں یہ خاصیت بھی موجود ہے کہ وہ روحانی نصب العینوں تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور اس کوشش

میں وہ اہم ترقی بھی حاصل کرتا ہے۔ اگر اپنی ابتدا اور آغاز کے لحاظ سے وہ اپنے سے کمتر حیوانوں سے مماثل ہے اور فطری ارتقا کی پیداوار ہے تو ارتقا کو ایک ایسا عمل تسلیم کرنا ہوگا جس کے نتیجہ میں ایک ایسی شاندار مخلوق وجود میں آئی۔ الٰہیات کے لئے یہ چیز ضروری ہے کہ وہ جدید مذہبی مشاہدے کے حقائق کا مکمل طور پر تسلیم کرنا اور ان لوگوں کے لئے اس کی افادیت کا اقرار جن کی زندگی میں یہ مشاہدات پیش آتے ہیں۔ ہر دوسری شے ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور اگر وہ دوسرے قابل تصدیق حقائق (مثلاً وہ اپنی تشریح کے لئے نظریۂ ارتقا کا تقاضا کرتے ہیں) سے ٹکراتی ہو تو یا تو ہمیں اس کی تاویل کرنی ہوگی یا اسے رد کرنا ہوگا۔

ان دو اساسی عناصر کے علاوہ کم از کم تین اور کم اہم عناصر بھی ہیں جنہوں نے نظریۂ ارتقا کے زیر اثر الہیاتی تشکیل میں اہم حصہ ادا کیا۔

ایک تو فلسفیانہ نظاموں کا وجود تھا جو ایک طرف انسانی تاریخ کی ایک عمومی ارتقائی تعبیر پیش کرتے تھے اور دوسری طرف اس کائنات کے متعلق ایک مذہبی نظریے کی صداقت کا دعویٰ کرتے تھے۔ کائنات کے متعلق یہ نظریہ صرف مذہبی ہی نہ تھا بلکہ خصوصی طور پر عیسائی روایات کے مطابق تھا۔ یہ مکاتیب فلسفہ اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ میں میبنیہ "رومانی تحریک" کے اجزا تھے اور اس کے بعد کی صدی میں ان کا اثر بہت نمایاں تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ہیگل کا نظام فلسفہ تھا جو جرمن فکر پر کئی سالوں تک چھایا رہا۔ اس کے بعد انگلستان میں ایک عقلی تحریک کی شکل میں کارفرما رہا اور پھر امریکہ میں اس نے یہی حیثیت اختیار کی[1]۔ دوسرا واقعہ یہ ہے جو ان نظامہائے فلسفہ کی تفصیلات سے واضح ہے کہ تشکیل جدید جس کا تقاضا کیا جاتا تھا وہ اتنی دور رس نہ تھی جتنا کہ اسے پیش کیا گیا۔ ارتقا بظاہر خدا کی ذات پر ایمان سے متناقض نہ تھا۔ کم از کم یہ تسلیم کرنا ممکن تھا کہ وہ طویل طبعی عمل جس کی آخری شکل انسان ہے خدا کی مشیئت اور حکمت کی راہنمائی میں ظہور پذیر ہوتا رہا۔ اگرچہ خود سائنس کو اس بات کے فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر انسان خدا سے تعاون کریں تو مستقبل میں اس سے بھی بہتر مقاصد حاصل ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے ارتقائی تصورات کے تقاضوں اور

---

[1] ہیگل کا نشو و ارتقا (DEVELOPMENT) کا نظریہ ڈارون کے نظریہ سے بالکل مختلف تھا۔ ہیگل کے نزدیک وہ ایک عقلی عمل ہے جو ایک مقررہ منطقی اسلوب کی پیروی کرتا ہے۔

مضمرات کو تسلیم کرتے ہوئے بھی انسان کی مذہبی تاریخ میں مسیح ناصری کے لئے ایک اعلیٰ اور بلند مقام کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ اکثر جدیدیت پسندوں کا یہ قول تھا کہ وہ انسانی صورت میں ارتقائی عمل کی بہترین پیداوار تھے اور اسکے متعلق معتقدات کی تعبیر و تاویل اس تصور کی روشنی میں کرتے تھے ایک تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ مذہبی تاریخ کی ارتقائی تعبیر سے بعض حساس لوگوں کی ذہنی مشکل کا حل پیدا ہو گیا جو قدیم راسخ العقیدہ نظریے سے پیدا ہوتی تھی۔ چونکہ موحز الذکر کا عقیدہ تھا کہ ساری بائیبل ایک الہامی کتاب ہے اس لئے لازمی تھا کہ کل بائیبل کو خدا کی مشیئت کا اظہار سمجھا جائے مگر جب غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک طرف زبور میں اسرائیل کے دشمنوں سے انتقام لینے کا اصرار، جہنم کی آگ میں ابدی سزا کا ڈر، اور بنی اسرائیل کو ہدایت کہ وہ اپنے قیدیوں کو جس میں آدمی، عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں تہ تیغ کر دیں وغیرہ خیالات موجود ہیں اور دوسری طرف اس خدا کے متعلق مذکور ہے کہ وہ رحیم و شفیق اور دردمند ہے[۲]۔ وہ لوگ جنہیں موحز الذکر تصور اخلاقی طور پر مرجح معلوم ہوا اور جن کے نزدیک مذہب کی روح حقیقی یہی ہے ان کے لئے خدا کی ان دو مختلف تصویروں میں تطابقت پیدا کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ ایسے لوگوں کے لئے نظریۂ ارتقا ایک نعمت ثابت ہوا۔ بنی اسرائیل اور اسی طرح عیسائیت کی تاریخ جو بائیبل بیان کرتی ہے ان کے نزدیک ایک ارتقائی نشو و نما تھی۔ جہاں پہلے خدا کے متعلق ایک خام اور بھونڈا تصور تھا وہاں بعد میں یہ تصور بلند، پاکیزہ اور اخلاقی ہو گیا۔ چنانچہ خدا کا یہ تصور کہ وہ ایک بے رحم حاکم مطلق ہے اور انسانوں کو سخت سزا دیتا ہے، مذہبی تصورات کے تدریجی ارتقا کی ابتدائی منزلوں پر قائم ہو لیکن بعد میں اسمیں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ یوحنا اور پولوس میں خدا کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے یہاں وہ انسانوں سے محبت اور رحمت کا پیکر ہے یہاں تک کہ خود اساسیین نے بھی تصورات کے اس تضاد کو کم کرنے کے لئے نیم ارتقائی سا نظریہ تسلیم کر لیا۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا کا انسانوں سے تعلق دو طرح کا رہا ہے۔ ایک کا اظہار عہد عتیق میں نظر آتا ہے اور دوسرے کا عہد جدید میں۔ پہلے میں اس کے فضل و بخشش کا اظہار مکمل طور پر نہیں ہوا۔

---

[۲] زبور ۳۵، ۶۹۔ متی ۱۳: ۳۸-۴۳، ۲۵: ۴۱-۴۶۔ قضاۃ ۲۰، ۲۱